سورة النجم

جمہور کے نزدیک یہ مکی ہے۔ابن عباسؓ نے کہا ایک آیت کے علاوہ جو کہ مدنی ہے۔وہ ہے **الذین یجتنبون کبائر الاثم والفوا حش** الخ. بعض نے کہا یہ پوری سورۃ مدنی ہے جبکہ پہلا قول صحیح ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) **وَالنَّجْمِ** (ترجمہ:۔قسم ہے چمکتے ستارے کی) ابو اسحاق نے کہا اللہ تعالیٰ نے نجم کی قسم کھائی ہے اور تفسیر میں آیا ہے کہ ثُریا ہے اسی طرح سے عرب اُسے نجم کا نام دیئے ہیں۔ابن سیدہ کہتے ہیں نجم ستارے کو کہتے ہیں اور یہاں ثریا کو مخصوص کر دیا گیا ہے اسی وجہ سے وہ علم ہے اور یہ از قسم صعق ہے۔سیبویہ نے بھی اس قسم کی ترجمہ و تفسیر میں یہی کہا ہے کہ یہ وہ قسم ہے کہ جس میں کسی چیز پر اس کے افراد میں سے ہر فرد کا نام غالب آ جاتا ہے یا وہ معرف یا اسماء کی صفت میں شامل ہوتا ہے حالانکہ وہ صفت نکرہ اور مذکورہ معانی کی جامع ہو۔اس نے صعق اور نجم کی مثال پیش کی ہے۔ابن جنّی کہتا ہے کہ اسم ہے اور اس کا علم مثلاً زید، عمرو، جب وہ **طلع النجم** کہتے ہیں تو اُس سے مراد ثریا ہوتا ہے اور جب اس میں سے "ال" نکالدیا جائے تو نکرہ ہو جاتا ہے۔حدیث میں ہے کہ جب نجم طلوع ہوتا ہے تو مصیبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ابن بری کا قول ہے کہ اس سے مراد ثریا ہے اور اس حدیث میں بھی یہی مراد ہے اور اس کے طلوع سے مراد ہے صبح کے وقت اس کا طلوع ہونا اور وہ مئی کے درمیانی عشرہ ہوتا ہے اور اس کا ڈوبنا صبح کے ساتھ ہوتا ہے۔اکتوبر کے درمیانی عشرہ میں اور عرب گمان کرتے ہیں کہ اس کے طلوع اور غروب کے درمیان میں پھلوں، جانوروں اور انسانی ہلاکتیں وبائیں اور امراض پیدا ہوتے ہیں اور غروب ہونے کی مدت کہ راتوں میں نظر نہ آئے پچاس سے کچھ زائد راتیں ہوتی ہے کیونکہ وہ سورج کے قریب ہی اس سے پہلے یا بعد غروب ہوتا ہے اور جب اس سے دور ہو جاتا ہے تو صبح کے وقت مشرق میں ظاہر ہوتا ہے۔حربی کہتا ہے۔اس حدیث سے مراد سرزمین حجاز ہے کیونکہ مئی کے مہینے میں کٹائی شروع ہوتی ہے اور پھل اُترنا شروع ہوتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ان میں ہلاکت کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔قتیبی کہتے ہیں کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی مراد خاص طور پر پھلوں کی بیماریاں ہیں جو دور ہو جاتی ہیں۔بعض مفسرین کا قول ہے کہ نجم سے مراد "شعریٰ" ہے کیونکہ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے **وانہ ھو رب الشعریٰ** اور شعریٰ دو ستاروں کا نام ہے ان میں سے ایک عبور ہے جو جوزہ میں ہوتا ہے اور دوسرا غمیصا جو ذراع میں ہوتا ہے۔عربوں کا گمان ہے کہ یہ دونوں ستارے سہیل ستارے کی بہنیں ہیں اور عرب کے کچھ قبائل ان کی پرستش بھی کرتے تھے۔اور یہ بھی قول ہے کہ نجم وہ ہے کہ جس کے ساتھ نشانہ لیا جاتا ہے۔اور سُدّی کہتا ہے یہاں پر نجم سے مراد زہرہ ستارہ ہے کیونکہ عرب کی کچھ اقوام اس کی عبادت کرتی تھیں۔اخفش کہتا ہے کہ نجم اس نبات کو کہا جاتا ہے جس کا تنا نہ ہو۔بعض مفسرین کا قول ہے کہ نجم قرآن کے ایک حصہ کو کہا جاتا ہے کیونکہ قرآن لوح محفوظ سے نجماً نجماً نازل ہوا ہے۔پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں کیونکہ عرب نجم سے ثریا کے علاوہ کوئی اور مراد نہیں لیتے۔اور اس پر بہت سارے اشعار بھی دلائل

کرتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی اور مطلب بھی لیا جاتا ہے جب اس کا کوئی قرینہ ہو۔ **اِذَا هَوٰى** (ترجمہ:۔ جب وہ غروب ہوا) صاحب کشاف کہتے ہیں کہ اذا ھویٰ کے معنی ہیں اذا غرب یا اس سے مراد ہے جب وہ قیامت کے دن منتشر ہوگا یا ٹوٹتا ستارہ معنی ہیں جس سے نشانہ لیا جاتا ہے یا نجم قرآن کے حصوں میں ایک حصہ ہے کیونکہ وہ بیس سال میں حصے حصے ہوکر اُترا ہے۔ اذا ھویٰ بمعنی اذا نزل ہے یا اس سے مراد وہ نبات ہے جو زمین پر گر جائے اور اس نے کہا ہے کہ حضرت ابن زبیر کی روایت ہے کہ عتبہ بن ابی لہب جس کے عقد میں رسول اللہ کی بیٹی تھیں شام کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا کہ میں ضرور محمد ﷺ کے پاس جاؤنگا اور اذیت پہونچاؤنگا۔ پھر وہ آپ کے پاس آیا اور بولا اے محمد ﷺ میں اذا ھویٰ اور دنیٰ فتدلیٰ کی صفت کے حامل ستارے کو نہیں مانتا پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تھوکا اور آپ ﷺ کی بیٹی کو طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے دعا کی **اللھم سلط علیه کلباً من کلابک.** اس وقت ابو طالب بھی موجود تھے تو وہ لرز کر رہ گئے اور انہوں نے کہا کہ بھتیجے اس قسم کی دعا سے کیا حاصل ہوا؟ اس کے بعد عتبہ اپنے باپ کی طرف آیا اور ساری بات بتائی پھر وہ لوگ ملک شام کی طرف روانہ ہوگئے اور ایک منزل پر پڑاؤ کیا تو ایک راھب کلیسا سے ان کی طرف آیا اور کہا کہ یہ چیر پھاڑ کر کھانے والے درندوں کا علاقہ ہے تو ابولہب نے اپنے ساتھیوں سے کہا اے گروہ قریش آج کی رات ہماری مدد کرنا مجھے اپنے بیٹے پر محمد ﷺ کی بددعا پوری ہونے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے اپنے اونٹ جمع کر لئے اور ان کو ان کے اردگرد بٹھا دیا اور عتبہ کے گرد انہوں نے حلقہ باندھ لیا۔ پھر ایک شیر آیا ان سب کو سونگھتا رہا یہاں تک کہ اس نے عُتبہ کو پنجہ مارا اور ہلاک کر دیا۔ اس حدیث کو شیخ طبری اور سیوطی نے روایت کیا ہے لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کی طلاق کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

(۲) **مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى** (ترجمہ:۔ تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہوا نہ بے راہ ہوا) یعنی محمد ﷺ حق سے گمراہ اور بے راہ نہیں ہوئے۔ غَیی رُشد کی ضد ہے اور ابوعبید سے ہے کہ غویٰ 'ضلّ کے معنی میں ہے۔ ابن اعرابی کہتا ہے کہ غیّی کے معنی فساد ہیں اور حدیث میں ہے جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو وہ سیدھے راستہ پر رہا۔ اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی تو یقیناً وہ گمراہ ہوگیا۔ اس آیت میں خطاب قریش کو کیا گیا ہے۔

(۳) **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى** (ترجمہ:۔ اور وہ اپنی خواہش نفس سے بات نہیں کرتے) یعنی ان کی گفتگو اپنی خواہش سے نہیں ہوتی۔ ابوعبیدہ نے کہا کہ اس آیت میں ''عن'' بمعنی ''با'' ۔ عن الھوی یعنی بالھویٰ. علامہ ابن ھشام مغنی میں کہتے ہیں کہ پہلی حالت اپنی اصل کے مطابق ہے۔ امام احمد نے فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔ تو بعض صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ جو آپ ہمیں بلاتے ہیں (تو کیا وہ بھی؟) تو آپ نے فرمایا کہ میں حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔

(۴) **اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** (ترجمہ: یہ تو حکم خدا (وحی) ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے) یعنی غرض وخواہش

سے کوئی بات نہیں کرتے۔ مقصد یہ کہ آپ وہی کچھ فرماتے ہیں جس کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے۔ آپ اُسے لوگوں تک ویسے ہی پہونچاتے ہیں جیسا کہ آپ کو حکم دیا جاتا ہے بغیر ذاتی چاہت اور کسی نقصان کے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ بات جو رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں خواہ اس کا تعلق احکامات وغیرہ ہی سے ہو اس میں ذاتی خواہش کی ملاوٹ نہیں ہوتی اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ **ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی** کا ارشاد ربانی احکامات سے متعلق ہے کیونکہ بعض وہ باتیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ان کی اللہ کی طرف سے اصلاح فرمادی گئی اور اس کی کئی وجوہات بھی ہیں پہلی دلیل اللہ کا ارشاد ہے **ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ واللہ عزیز حکیم** .(الانفال ۶۷) اس کی تفصیل حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے قیدیوں کو گرفتار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ابوبکرؓ و عمرؓ سے فرمایا کہ ان قیدیوں کے بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے تو ابوبکرؓ نے عرض کی۔ یارسول اللہ ﷺ یہ لوگ اپنے کنبے اور چچاؤں کی اولاد ہیں۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے۔ جو کفار کے خلاف ہماری قوۃ بنے۔ ممکن ہے اللہ انہیں اسلام کی ہدایت عطا کرے پھر رسول اللہ ﷺ نے عمرؓ سے فرمایا آپ کا کیا مشورہ ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں اللہ کی قسم یارسول اللہ ﷺ ابوبکر کے مشورہ کی طرح نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو ہم کو ان کی گردنیں اڑا دینی چاہیئے۔ آپ ﷺ حضرت علیؓ کے قبضہ میں عُقیل کو دے دیں کہ وہ اس کی گردن اڑائے اور حضرت حمزہ کے قبضہ میں عباس کو دیدیں کہ وہ اس کی گردن اڑائے اور فلاں میرے قبضہ میں دے دیں تا کہ میں اس کی گردن اڑاؤں کیونکہ یہ کفر کے سردار و پیشوا ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے وہی چاہا جو ابوبکرؓ نے کہا اور جو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا اسے آپ نے قبول نہیں کیا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب میں اگلے دن رسول اللہ ﷺ کے پاس پہونچا تو رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ دونوں رو رہے تھے تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ اور آپ کے ساتھی کس بات پر رو رہے ہیں۔ آپ بتائیے، مجھے اگر رونے کی بات نظر آئی تو میں بھی روؤنگا اور ایسی بات نظر نہیں آئی تو رونے والوں کی صورت بناؤنگا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھیوں کی طرف سے قیدیوں کے فدیہ لینے کے بارے میں رو رہا ہوں مجھے ان پر آنے والا عذاب اس درخت سے زیادہ قریب دکھایا گیا اور اس سے ظاہر یہی ہے کہ قیدیوں سے فدیہ لینا مشیت الٰہی کے خلاف ہے۔

دوسری دلیل اللہ کا یہ ارشاد **عفاک اللہ عنک لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا و تعلم الکاذبین** .(التوبہ ۴۳). طبری فرماتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے عتاب ہے جو روم کی طرف غزوہ تبوک کے موقعہ پر جاتے وقت منافق لوگوں کے اس غزوہ سے پیچھے رہنے کی اجازت مانگنے پر آپ ﷺ کی منظوری پر ہوا۔ اس سے ظاہر یہی ہے کہ ان لوگوں کے پیچھے رہنے کی اجازت کو اللہ نے پسند نہیں فرمایا۔

تیسری دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے **ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین و لو کانوا اولی قربی من**

بعد ماتبین لھم انھم من اصحاب الجحیم(التوبہ ۱۱۳) اور چوتھی دلیل کھجوروں کو نر لگانے والا واقعہ ہے وہ یہ کہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو لوگوں کو کھجوروں میں نر لگانے سے منع فرمایا جس کی وجہ سے اس سال کھجوروں میں پھل نہیں لگا تو انہوں نے رسول ﷺ سے حقیقت حال عرض کی جس پر آپ ﷺ نے فرمایا تم اسے کیا کرو میں تمہارے دنیاوی معاملات میں تم سے زیادہ نہیں جانتا۔ یہ تمام وجوہات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس آیت میں ''نطق'' سے مراد احکام شریعہ کا نطق ہے اور کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ﷺ شرعی احکام کے متعلق وحی وتنزیل کے علاوہ کوئی بات نہیں فرماتے۔ **واللہ اعلم اسرار کلامہ فان علمہ او فی واتم**۔ اور وحی کے معنی ہیں اشارہ، کتابت، رسالت، الہام اور مخفی کلام۔ ابوالہیثم کہتا ہے کہ **وحیت الی فلان ، اوحی الیہ وحیا** اور **اوحیت الیہ اوحی ایحاءً** اس وقت بولے جاتے ہیں جب آپ کسی سے رمز وکنائے کا رویہ اختیار کریں۔ فراء کہتے ہیں کہ **فاوحی الیھم** کے معنی ہیں **اشار الیھم** اور کبھی کبھار وحی بمعنی کتابت کے بھی آتا ہے۔ کبھی مکتوب اور کتاب کے معنوں میں آتا ہے۔ حارث اعور کی حدیث میں ہے کہ علقمہ نے کہا کہ میں نے قرآن کو دو برسوں میں پڑھا تو حارث نے کہا کہ **القرآن ھین الوحی اشد منہ** یہاں قرآن سے مراد قراءت ہے (اس کا پڑھنا) اور وحی سے مراد کتابت اور خط ہے (اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا پڑھنا آسان ہے اور لکھنا مشکل ہے) اور کبھی کبھار وحی کا لفظ رسالت کے معنی میں آتا ہے۔ ابن اعرابی کہتا ہے کہ جب کسی قابل اعتماد شخص کو کسی غلام کی طرف بھیجا جاتا ہے تو اس وقت کہتے ہیں (**اوحی الرحل**) اور قرآن اکثر وبیشتر الہام کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **اوحی ربک الی النحل** (النحل ۶۸) اسی طرح **بان ربک اوحی لھا** .(الزلزال ۵) یعنی **اوحی الیھا** . ان معنوں میں عجاج کا شعر ہے۔

وحی لھا القرار فاستقرت وشدّھا بالراسیات الثبت

یعنی اُسے قرار سے رہنے کا الہام فرمایا تو وہ سکون والی ہوگئی۔ اس کو گڑے ہوئے بلند وبالا پہاڑیوں کے ساتھ مضبوط کر دیا یعنی اللہ نے زمین کو قرار پکڑنے کے لئے الہام فرمایا اور اس بات کا کہ اپنے اوپر رہنے والوں کے لئے ہلے جُلے نہیں اس میں **اوحی** بمعنی **الھم** کے ہیں۔ اس طرح اللہ نے فرمایا کہ **اوحینا الی اُم موسیٰ**. (القصص ۷) زہری کہتا ہے کہ وحی بمعنی القاء والہام کے ہے۔ یعنی کہ ہم نے موسیٰ کے دل میں بات ڈالی۔ کبھی کبھار مخفی کلام کے بارے بھی آتا ہے۔ ابواسحاق کہتا ہے کہ عربی لغت میں وحی کے اصل معنی مخفی طور پر آگاہ کرنا ہے اسی وجہ سے الہام کو وحی کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں اللہ کا ارشاد ہے کہ **ما کان بشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا اومن وراء حجاب** . اس کے معنی ہوں گے کہ سوائے اس کے کہ اس کی طرف الہام فرمادے۔ پھر اُسے وہ کچھ سکھادے جو بشر کو سکھاتا ہے۔ اس نے اُسے یا تو الہام کے طور پر یا دکھلاوے کے طور پر سکھلایا۔ اس طرح کہ کتاب نازل فرمائی جیسے موسیٰ ؑ پر۔ یا اس پر قرآن نازل کردے جو اُس پر پڑھی جاتی ہو۔ جسے اس نے سیدنا محمد ﷺ پر نازل فرمائی۔ یہ سب آگہی کے ذریعہ ہیں۔ اگرچہ آگہی کے اسباب مختلف ہیں ائمہ لغت نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ پھر وحی کی تین قسمیں ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ **و ماکان لبشر ان**

یکلمه الله الا وحیا او وراء حجاب اویرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء انه علی حکیم .(الشوریٰ ۵۱) اس میں وحیاً القاء اور الہام کے معنی ہیں اور من وراء حجاب سے مراد پردے کے پیچھے سے اللہ کا کلام کرنا ہے۔اور یرسل رسولاً سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نبی کی طرف بھیجتا ہے اور اپنی اجازت سے جو چاہتا ہے وہ وحی کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا خطاب جسے نبوت کہا جاتا ہے اس کی بھی تین قسمیں ہیں ایک تو وہ جسے وحی کہا جاتا ہے، دوسرا وہ جس میں کلام پردہ کے پیچھے سے سنائی دیتا ہے اور تیسرا رسول کے واسطے سے ہوتا ہے۔ پھر وہ بشر یا فرشتہ اللہ کی اجازت سے اس ہستی کی طرف وحی کرتا ہے جس کی طرف اللہ نے بھیجا ہو۔ جب وہ رسول اللہ کی طرف سے ترجمانی کرتا ہے تو وہ اللہ ہی کا کلام ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے پھر اس کی طرف سے وحی بغیر کسی واسطے کے بندوں کے قلوب کی طرف القاء کی جاتی ہے اور وہ ان کے قلوب میں بات اس طرح سے سنواتا ہے کہ اس کی سماعت کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اور نہ کوئی اس کی حد ہوتی ہے اور نہ اُسے کوئی ذہن تصور میں لاسکتا ہے۔اس کے باوجود وہ اس کو سمجھتا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کلام کیسے آ رہا ہے اور کہاں سے آ رہا ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟ اور کبھی اس سے حجاب کے پیچھے سے کلام کرتا ہے اور کبھی حجاب کی صورت خود اس کی بشریت ہوتی ہے اور کبھی حجاب ہوتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے طور کے دائیں طرف سے درخت میں سے کلام فرمایا اس لئے کہ اگر بائیں طرف سے کلام فرماتا جو کہ جہت قلب بھی ہے تو اس پر خود کلامی کا التباس ہو جاتا۔اسی لئے دائیں طرف سے کلام آیا کہ اس کے بارے میں اُس طرف سے خود کلامی کا معمول نہیں ہوتا۔اور کبھی کبھار بھیجے ہوئے فرشتے کے واسطے سے کلام فرماتا ہے۔جیسا کہ اللہ فرماتا ہے نزل به الروح الامین علی قلبک(الشعراء ۱۹۳) یعنی بالقرآن الذی هو کلام الله اور کبھی کبھار بواسطہ بشر بھی ہوتا ہے۔اللہ فرماتا ہے فاجره حتی یسمع کلام الله .(التوبہ ۶) اس میں کلام کو اللہ کی طرف اضافت دی گئی ہے۔حالانکہ صحابہ نے اور نہ اس اعرابی نے اُسے اللہ سے نہیں رسول ﷺ کی زبان سے سنا اور کبھی کبھار فرشتہ کی صورت میں اس سے بات ہوتی ہے پھر وہ فرشتہ محسوس اور نظر آنے والے شخص کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر حاضر لوگ اس کے ذریعہ ادراک حاصل کر لیتے ہیں اور وہ ان کے کانوں پر اپنے رب کی بات القاء کرتا ہے اور یہی وحی ہوتی ہے اور کبھی کبھار رسول اللہ ﷺ کے قلب پر نازل ہوتی تھی تو آپ کو تکان ہونے لگتی۔احادیث میں اسی حالت کی تعبیر کی گئی ہے۔ چونکہ اس سے طبیعت مناسبت نہیں رکھتی اس وجہ سے اس پر گراں ہوتا ہے اور اس کی طرف وحی کردہ کو ادا کرنے کے لئے انسانی مزاج انحراف کرنے لگتا ہے۔جب وہ کیفیت زائل ہو جاتی ہے تو وہ بیان کرنے لگتا ہے جو اس سے کہا گیا تھا۔یہ فتوحات مکیہ سے تلخیص ہے۔

(۵) **عَلَّمَهٗ** (ترجمہ:اس نے انہیں سکھایا) یعنی محمد ﷺ کو **شَدِيْدُ الْقُوٰى** (ترجمہ:۔بڑی قوتوں والے نے) یعنی اس سے مراد جبرئیلؑ ہے اور اس کی شدت قوت ہی تھی کہ اس نے قوموں کی بستیاں اکھاڑ کر آسمانوں کی طرف اٹھالیں۔ یہاں تک کہ آسمان والے اُن معتوب ومعذوب افراد کی چیخیں سننے لگے۔پھر اس نے انہیں پلٹ کر زمین پر دے مارا۔

(۶) **ذُوْمِرَّةٍ** (ترجمہ:۔زور آور نے) یعنی قوت والے نے اور اسی جیسا اللہ کا قول ہے۔ ذی قوة عند ذی العرش

المکین. (التکویر ۲۰) قطرب نے کہا یہ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو صائب الرائے پختہ عقل والا ہو۔ اللحیانی نے کہا المرة یعنی القوة و شدة العقل. فَاسْتَوٰی (ترجمہ:۔ ہوا) تو اس نے یعنی محمد ﷺ کو وحی کرنے کے بعد جبریل اپنے ٹھکانے کی طرف آسمانوں میں بلند ہوئے۔ حسن نے کہا الرحمٰن نے عرش کی طرف استوٰی فرمایا۔ پہلا زیادہ وقیع ہے

(۷) وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (ترجمہ:۔ اور وہ افق اعلیٰ پر تھے) یعنی جبرئیلؑ جب بلند ہوئے وہ مشرقی جانب تھے اور افق۔ آسمان کا کنارہ۔ آفاق اور کہا جاتا ہے وہ سورج کے طلوع کی جگہ ہے۔ اور اہل حقائق نے کہا افق سے مراد افق روحانی ہے اور "ھو" کی ضمیر جبرئیل کی جانب لوٹ رہی ہے جیسا کہ جمہور متکلمین کا رجحان غالب ہے۔ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوبار کے علاوہ انہیں اصلی صورت میں کبھی نہیں دیکھا جہاں تک ایک بار کا سوال ہے آپ ﷺ نے ان سے ان کی صورت میں دیکھنے کی فرمائش کی تو اس نے پورے افق کو بھر دیا اور جہاں تک دوسری بار کا سوال ہے تو اس وقت وہ ان کے ساتھ تھے جب وہ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے ۔ابن کثیر نے اس آیت کے معنی یہ کئے ہیں فاستوی یعنی اس قوی الاعضاء زور آور نے استوی فرمایا اور محمد ﷺ افق اعلیٰ پر تھے یعنی دونوں نے افق اعلیٰ پر ظہور فرمایا۔ شیخ محمد ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں و ھُو کی ضمیر کو فاستویٰ پر عطف کرتے ہوئے نبی ﷺ کا ذکر مراد لیا ہے اور کلام عرب میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس قسم کے مقامات پر عطف کرنا چاہتے ہیں تو معطف علیہ کے کنایہ کو ظاہر کرتے ہیں تو پھر وہ یوں کہتے ہیں استوی ھو فلان اس کے بجائے استوی و فلان کو بہت ہی کم کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے عطف میں سے یہ آیت مبارکہ بھی ہے۔ و اذا کنا تراباً واباونا. (النمل ۶۷) اس میں آباء کو نحن ضمیر کو ظاہر کئے بغیر کُنّا میں پوشیدہ ضمیر پر عطف کیا گیا۔ اسی طرح سے فاستوی و ھو بھی ہے۔ حاصل معنی یہ ہوا کہ محمد ﷺ اور جبرئیل امین بلند ہوئے اور دونوں نے افق اعلیٰ میں استوی کیا اور جبرئیل افق اعلیٰ ہی پر رہ گئے اور رسول ﷺ تنہا اوپر تشریف لے گئے جہاں تک اللہ نے چاہا۔ جیسے کہ اس بات کی طرف اس ارشاد کے اندر اشارہ فرمایا گیا ہے۔

(۸) ثُمَّ دَنَا (ترجمہ:۔ پھر وہ قریب ہوا) یعنی رسول ﷺ اپنے رب کے قریب ہوئے۔ فَتَدَلّٰی (ترجمہ:۔ پھر زیادہ قریب ہوا) زجاج نے کہا کہ دَنی فتدلیٰ کے معنی ایک ہی ہیں یعنی قریب ہوا اور قرب میں اور بڑھ گیا۔ فتدلّٰی کے بارے میں فراء کا قول ہے کہ اس میں 'فا' بمعنی واؤ کے ہے۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ ھُوَ محمد" دَنَی فَتَدلّٰی مِن رَبِّہ اس سے مراد ہے کہ محمد ﷺ قریب ہوئے اور زیادہ قریب ہوئے اپنے رب کے۔

(۹) فَکَانَ (ترجمہ:۔ پھر تھا) یعنی محمد ﷺ اور اس کے رب کے درمیان اور یہ بھی قول ہے کہ محمد ﷺ اور جبرئیلؑ کے درمیان قَابَ قَوْسَیْنِ (ترجمہ:۔ دو کمانوں کی مقدار) یعنی دو کمانوں کے فاصلہ کے برابر تھا 'قاب قوس' قیب قوس' قاد قوس' اور قید قوس' ان تمام کا مطلب ہے "کمان کے برابر"۔ صاحب لسان العرب کا کہنا ہے کہ ہر قوس کے لئے دو قاب ہوتے ہیں اور وہ دستہ اور نوک کے درمیان ہوتے ہیں۔ فراء نے کہا یعنی دو چھوٹی کمانوں کے برابر اس طرح ابن اثیر نے بھی کہا ہے اور اس کے معنی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ اپنے رب سے دو چھوٹی کمانوں کے فاصلہ کے برابر نزدیک ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جبرئیلؑ کے قریب ہوئے۔ اہل حقائق کا قول ہے کہ قوسین سے مراد دائرہ وجود کے دو قوس ہیں، وجوب اور امکان کا قوس وجود کے ساتھ ان دونوں کے درمیان خطِ فاصل ہے یعنی یہ دونوں قوس چھوٹے نیزوں کے برابر نزدیک ہوئے۔ **اَوۡ اَدۡنٰی** (ترجمہ:۔ یا اس سے بھی زیادہ نزدیک یعنی قوسین کے فاصلہ سے)۔ اہل حقائق کہتے ہیں کہ او بمعنی بل ہیں یعنی **بل ادنیٰ من قرب قوسین الوجود حتیٰ سقط من بینھما الخط الفاصل** (بلکہ دائرہ وجود کے اور بھی زیادہ قریب ہوا یہاں تک دونوں کے درمیان سے خط فاصل گر گیا) اور یہ فنا اور عروج کا انتہائی (بلند) مقام ہے اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ او' بل کے معنی میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ سیبویہ سے مروی ہے کہ اس نے اسے دو شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ پہلی شرط ہے فی کا مقدم ہونا یا نہی کا۔ دوسری شرط ہے عامل کا اعادہ جیسے **ماقام زیدٌ ما قام عمر**۔ اس کے معنی ہیں **بل ما قام عمرٌ ولا یقم زیدٌ اولا یقم عمرٌ** اور اس کی تائید اس ارشاد ربانی سے ہوتی ہے۔ **ولا تطع منھم آثماً او کفوراً** (الدھر ۲۴) اگر اسے **اولا تطع کفورا** پڑھا جائے گا تو معنی بدل جائیں گے۔ اس صورت میں وہ نہی اول سے روگردانی ہو جائے گی اور دوسرے سے نہی ہو جائے گی۔ اور کوفی اور ابوعلی اور ابوالفتح اور ابن برہان کا کہنا ہے کہ یہ دونوں (او اور بل) مطلقاً اضراب کے لئے آتے ہیں اور اسی قبیل سے ابوسمال کی قرأت ہے۔ **اَوَ کُلَّما عاھدوا عھداً نَبذَهُ فریقٌ منه** اسمیں اَوَ کو واؤ کے سکون کے ساتھ (اَوْ) پڑھا گیا ہے۔ فراء کہتا ہے کہ یہ محض عربی زبان میں ہے۔ تو اہل حق کے قول کے مطابق ارشاد ربانی "اَو اَدۡنیٰ" میں "اَو" بمعنی "بل" کے عربی زبان کے اعتبار سے درست ہے یہی کوفیوں اور فراء کا مذہب ہے۔

(۱۰) **فَاَوۡحٰی اِلٰی عَبۡدِهٖ مَآ اَوۡحٰی** (ترجمہ۔ تو اس نے اپنے بندہ کی طرف وحی کی جو اس نے وحی کی) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ محمد ﷺ کی طرف وحی فرمائی جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ربیع، حسن، ابن زید اور قتادہ کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب ہے **اوحی جبرئیلؑ الی محمد ما اوحی الیه ربه** (جبرئیلؑ نے محمد ﷺ کی طرف وہی وحی کی جو اس کے رب نے اُسے وحی کی تھی) اس قول کے مطابق ضمیریں مختلف ہو جائیں گی کیونکہ "فاوحی" میں ضمیر جبرئیلؑ کی طرف لوٹے گی اور عبدہٖ میں موجود ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **اوحی اللہ الی عبدہ جبرئیلؑ** (اللہ نے اپنے بندہ جبرئیل کی طرف وحی فرمائی) لیکن سب سے پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر "مااوحی" فرمایا ہے لیکن "وحی" کے بیان کو مُبہم رکھا ہے۔ یہ محض "وحی" کی شان ظاہر کرنے کے لئے ہے اور اس کی مثال اللہ کا یہ ارشاد ہے "**فغشھم من الیم ما عشیھم**" (طه ۷۸) اس میں "**غشیان الیم**" کی ہولناکی اور اس میں غرق ہونے والوں کے واقعہ کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ وحی کے بیان کو مبہم رکھنا محض قلب محمد ﷺ پر القاء ہونے والے راز کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اور جس شخص نے یہ کہا ہے کہ "ما" عموم کے لئے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ چیز جو اس نے وحی کی یہ معنی لینا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ اکثر احکامات و قوانین اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کے ذریعہ شب معراج کے بعد نازل فرمائے۔ اور ایک چیز کی تکرار کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس لئے یہاں عموم مراد نہیں لیا جا سکتا اور اکثر مفسرین کا اس آیت کی تفسیر کے

متعلق کلام مضطرب ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۱۱) **مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى** (ترجمہ:۔ جو اس نے دیکھا اس کو قلب نے نہیں جھٹلایا)۔مبرد کہتا ہے نبی ﷺ نے جس چیز کو دیکھا آپ کے قلب مبارک نے اس کی تصدیق کی اور آیت مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے اپنے رب عزوجل کو اپنے سر کی دونوں آنکھوں سے دیکھا اور آپ کے قلب مبارک نے اس کی تصدیق کی یعنی رویت باری کا یقین حاصل ہوا۔ اور یہی اہل سنت کے اکثر علماء اور اکثر صحابہ و تابعین کا مذہب ہے۔مثلاً ابن عباس، کعب احبار، عکرمہ، ابوصالح، مجاہد وغیرھم اور انس، ابوذر غفاری کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو قلب کے ذریعہ دیکھا جیسے کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے بغوی نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی آنکھ سے اللہ کا دیدار کیا اور یہی انس حسن اور عکرمہ کا قول ہے اور یہ قول ابن عباسؓ اور عائشہؓ کے درمیان مختلف فیہ ہے جیسے کہ شعبی سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ عرفہ کے میدان میں حضرت کعب سے ملے انہوں نے کسی شئی کے بارے میں سوال کیا پھر اس زور سے اللہ اکبر کہا کہ پہاڑوں میں آواز گونج اٹھی۔پھر انہوں نے کہا ہم بنو ہاشم گمان کرتے ہیں کہ یقیناً محمد ﷺ نے اپنے رب کو دوبار دیکھا اور کعب احبار نے کہا کہ رویتہ اور کلام کو اللہ نے محمد ﷺ اور موسیٰؑ کے درمیان تقسیم فرمادیا۔محمد ﷺ نے اپنے رب کو دومرتبہ دیکھا اور موسیٰؑ نے دوبار کلام کیا۔مسروق نے کہا کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس حاضر ہوا اور اُن سے پوچھا کہ کیا محمد ﷺ نے رب کو دیکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ تم نے ایسی بات کی ہے کہ جس سے رونگٹے کھڑے ہوگئے تو میں نے کہا رہنے دیجئے اور یہ آیت **لقد رای من آیات ربه الکبریٰ** (النجم ۱۸) تلاوت کی جس پر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ کہاں جارہے ہو یہ تو جبرئیل ہے جس کسی نے بھی تم کو بتایا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا یا آپ ﷺ نے کچھ چھپایا ہے جو آپ کو پہونچانے کہا گیا تھا یا آپ پانچ چیزوں کو جانتے ہیں جن کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے **ان الله عنده علم الساعة..... الی آخرہٖ.** (لقمٰن ۳۴) تو اس نے بہت بڑا دھوکہ کھایا البتہ آپ نے جبرئیلؑ کو دیکھا تھا اور ان کی اصل صورت میں دومرتبہ' ایک مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک مرتبہ جیاد کے پاس اور اُن کے چھ سو پَر ہیں۔حضرت عائشہؓ ہی سے ایک اور روایت میں نبی ﷺ کے آسمانوں سے زمین کی طرف آتے وقت کے متعلق جریر کے مطابق یوں ہے کہ انہوں نے (عائشہؓ) کہا کہ سب سے پہلے میں نے ہی اس آیت کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد جبرئیلؑ ہیں۔البتہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تو وہ اپنی روایتوں کو رسول اللہ ﷺ تک پہونچاتے ہیں جیسے صحیح مسلم میں محمد بن کعب کے ذریعہ بعض اصحاب رسول سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کی اے اللہ کے رسول کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے آنکھ سے نہیں قلب کے ذریعہ دومرتبہ دیکھا ہے یہ کہکر آپ نے **دنٰی فتدلیٰ** آیت تلاوت فرمائی۔اور نسائی حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ تم لوگ اس بات پر کیوں متعجب ہو کہ خلۃ ابراہیمؑ کے لئے اور کلام موسیٰؑ کے لئے اور رویت محمد ﷺ کے لئے ہے اور ابن ابی حاتم نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپؐ نے فرمایا

کہ میں نے دومرتبہ اپنے دل کے ذریعہ دیکھا ہے پھر آپ نے **ماکذب الفواد مارای** تلاوت فرمائی۔امام احمد،عکرمہ کے ذریعہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت لائے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ **رایت ربی عزوجل** اور **ماکذب الفواد مارائ** کے متعلق ابوالعالیہ سے مروی ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے دل کے ذریعہ اللہ کو دیکھا اور آنکھ سے نہیں دیکھا اسے ابن جریر نے روایت کیا ہے اور سیوطی نے بھی اس کو اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں ذکر کیا ہے کہ عبداللہ ابن عمر نے عبداللہ ابن عباس کی طرف آدمی بھیج کر معلوم کرایا کہ آپ ﷺ نے کیا اپنے رب کا دیدار فرمایا تھا تو ابن عباس نے جواب بھجوایا کہ ہاں پھر ابن عمرؓ نے دوبارہ آدمی بھیجا کہ آپ نے کس طرح دیکھا تھا اور ابن عباسؓ نے جواب بھجوایا کہ آپ نے اُسے سبز گنبد میں دیکھا کہ جس کا فرش سونے کا تھا اور سونے ہی کی کرسی پر جسے چار فرشتے اٹھائے ہوئے تھے جن میں سے ایک فرشتہ انسانی صورت میں اور ایک فرشتہ بیل کی صورت اور ایک فرشتہ چیل کی صورت اور ایک فرشتہ اسد کی صورت میں تھا۔میں یہ کہتا ہوں کہ اس حدیث سے جسمانیت کی دلیل ملتی ہے اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے اُسے دیکھا کہ اس کے قدم سبزہ پر تھے اور اس کے پیچھے موتیوں کا پردہ تھا میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ **لا تدرکہ الابصار** (الانعام ۱۰۳) انہوں نے فرمایا کہ تیری ماں مرے۔اس سے مراد اللہ کا وہ نور ہے کہ جب اس نور کے ذریعہ تجلی فرماتا ہے تو کوئی بھی اس کا ادراک کرنہیں سکتا۔سیوطی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ابن مردویہ نے انس بن مالکؓ سے روایت نقل کی ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا۔یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ معراج کی شب رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا۔نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہؓ کا اس بارے میں اختلاف ہے۔بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رب کا دیدار نہیں کیا بلکہ جبرئیل کو دوبار دیکھا جیسے کہ حضرت عائشہؓ کا بھی یہی قول ہے اور ان میں سے کچھ کا یہ کہنا ہے کہ نبی ﷺ اپنے رب کو اپنے دل کے ذریعہ دیکھا۔اور یہ بعض صحابہ کرام کا قول ہے مثلاً ابوالعالیہ ابن عباس اور ابوذر غفاری اور بعض ان میں سے یہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے رب کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا اور یہ حضرت انس،کعب احبار وغیرہما کا قول ہے اور یہی اہل السنۃ کے اکثر علماء کا بھی مذہب ہے اور یہ بالکل واضح ہے کہ کسی چیز میں اختلاف اس کے امکان پر دلالت کرتا ہے کیونکہ معدوم کے متعلق اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔اسی طرح رویت کے حصول کے بارے میں اختلاف اس کے امکان پر دلالت کرتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رویت اس دنیا میں ممکن ہے اور اس مسئلہ کی تمام تر تفصیل "**رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی و لکن انظر الی الجبل فان استقرہ مکانہ وسوف ترانی**" (الاعراف ۱۴۳) کی آیت میں کی گئی ہے اسے وہاں دیکھئے۔اور ہشام نے **ماکذب** کو تشدید کے ساتھ بھی پڑھا ہے یعنی اس کی تصدیق کی اور اپنی آنکھ سے آپ ﷺ نے جو اللہ کا دیدار کیا اس میں شک نہیں کیا۔

(۱۲) **اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَایَرٰی** (ترجمہ:۔جو اس نے دیکھا تو اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟) یعنی تم اس بات پر اس سے نخوت کی وجہ سے جھگڑتے ہو؟ اور یہی جدال ہے۔۔ **مریت الشاۃ** اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب بکری کو دوھا جائے۔**مارأہ.**

مماراۃ . میراً کہا جاتا ہے۔ امتری فیه و تماری کے معنی ہیں اس نے شک کیا۔سیبویہ کہتا ہے یہ ان افعال میں سے جو واحد کے لئے آتے ہیں اور رسول ﷺ کی تعریف میں یوں کہا جاتا ہے کہ انه لا یشاری و لا یماری یعنی نہ ہی وہ کلام میں متردد ہوتے ہیں نہ حق سے پھیرے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں کسی بُرائی پر خریدا جاسکتا ہے۔عاصم کے علاوہ کوفیوں نے اسے ’’اَفَتَمْرُوْنَهٗ عَلٰی مَایَرٰی‘‘ بھی پڑھا ہے۔فراء کہتا ہے کہ پہلی قراءت عامتہ الناس کی قرأت ہے اور دوسری قرأت کے مطابق معنی یہ ہوں گے کہ کیا تم اُس سے جھگڑتے ہو۔مبرد کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ یعنی اس نے جو کچھ اور جہاں پر دیکھا تم اُس سے اُسے جھٹلانا چاہتے ہو۔ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ اللہ نے یہ دونوں قرأتیں اُتاری ہیں اور دونوں ہی مروج ہیں۔رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک سات قرأتوں پر نازل کیا گیا ہے۔پس جب کوئی بھی دوسرے کی قرأت کا انکار کرے تو اس کے بارے میں بے خوف نہیں رہا جاسکتا کہ اُس کی یہ روش اُسے کفر تک نہ پہونچادے کیونکہ اس نے نبی ﷺ پر نازل ہونے والے قرأت کی نفی کی ہے۔میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ تمام ائمہ قرأت کا یہی قول ہے سوائے اس کے کہ پہلی قرأت تاویل سے محفوظ ہے۔لہذا میرے نزدیک امام عاصم ابن ابی النجود کی قرأت اولیٰ ہے۔

(۱۳) **وَلَقَدْرَاٰهُ** (ترجمہ:۔ یقیناً انہوں نے اُسے دیکھا) یعنی اللہ تعالیٰ کو۔ **نَزْلَةً اُخْرٰی** (ترجمہ:۔ دوبارہ) یعنی دوسری مرتبہ۔ یہ نزلۃً نزول سے ہے۔فراء کہتا ہے کہ نزلۃً ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور وہ صاحب کشاف کا قول ہے۔ ابولبقاء کہتا کہ مصدریت کی وجہ سے منصوب ہے۔معنی یہ ہیں کہ آپ نے اُسے اُترتے ہوئے دوسری مرتبہ دیکھا۔حوفی اور ابن عطیہ نے کہا کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی آپ نے اُسے نزول کے دوران دیکھا۔ظاہر یہی ہے کہ نبی ﷺ نے اُسے دوبارد دیکھا ہے۔ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے اللہ کو دوبارد دیکھا،ایک مرتبہ آنکھ سے اور ایک مرتبہ دل سے۔

(۱۴) **عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی** (ترجمہ: سدرۃ المنتہٰی کے پاس) اور سدرۃ بیری کا درخت۔مروی ہے کہ اگر اس کا ایک پتہ زمین پر رکھ دیا جائے تو زمین بھر کو روشن کردے۔ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ابن زیاد نے کہا کہ سدرۃ کانٹے دار بیری ہے۔اور اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک عبریٰ اور ضالؔ۔عبری وہ جس میں کانٹے نہ ہوں اور ضال جو کانٹے دار ہو۔کانٹے دار بیری کے بیر چھوٹے ہوتے ہیں اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ سرزمین میں بہت ہی عمدہ بیر ’’نبق حجر‘‘ ہیں جو ایک ہی جگہ میں ہیں انہیں سلطان بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ بیر بہت ہی زیادہ میٹھے اور بہت ہی خوشبودار ہوتے ہیں۔کھانے والے کے اور چھونے والے کے ہاتھ اور منہ خوشبو سے بھر جاتے ہیں جیسے کہ عطر کی مہک آرہی ہو’’سدر‘‘ اسم جنس ہے اور کا واحد ’’سدرۃ‘‘ ہے۔اس کے مکان کے بارے میں اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ وہ چھٹے آسمان پر ہے اور دوسرے قول کے مطابق وہ ساتویں آسمان پر ہے۔اُسے کوئی فرشتہ اور نبی عبور نہیں کرسکتا اور اس نے جنت کو اپنے سائے میں لے رکھا ہے۔اور حدیث اسراء میں ہے کہ مجھے سدرۃ المنتہٰی کی طرف بلند کیا گیا۔ابن الاثیر کہتا ہے کہ سدرۃ المنتہٰی جنت کے آخری سرے پر ہے۔اولین وآخرین کا علم اس پر ختم ہوتا ہے۔اس سے آگے تجاوز نہیں کرتا۔اس تفسیر کی بنیاد پر سدرۃ کی منتہٰی

کی طرف نسبت کسی چیز کی اپنے مکان کی طرف نسبت کے قبیل میں سے ہے اور یہ بھی قول ہے کہ وہ جبرئیلؑ کا مقام ہے اور صالحین وشہدا کی ارواح اس کی طرف بلند ہوتی ہیں۔

(۱۵) **عِنْدَهَا** (ترجمہ:۔اس کے پاس) یعنی ''سدرہ'' کے پاس۔ **جَنَّةُ الْمَاْوٰى** (ترجمہ:۔جنت الماوی ہے) کہا گیا ہے کہ وہ عرش کے دائیں طرف ہے اور مومنوں کی ارواح وہیں تک رسائی حاصل کرتی ہیں۔ابودرداء، ابوھریرہ، ابن زبیر اور انس نے جَنّة الماوٰی پڑھا ہے اور ضمیر نبی ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی جنت الماوٰی کے پاس رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے انوار اور کمال کاریگری نے ڈھانپ لیا۔مروی ہے کہ حضرۃ عائشہؓ نے اس قرأت کو رد کر دیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا نظریہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آسمانوں کی طرف جسم کے ساتھ لے جایا گیا بلکہ وہ واقعہ آپ کے لئے کشف تام اور روحانی معراج تھا اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس قرأت کو جائز رکھا ہے۔

(۱۶) **اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى** (ترجمہ:۔جب سدرہ کو ڈھانپ دیا جس نے ڈھانپ دیا) کہا گیا ہے کہ اُسے سونے کی ٹڈیوں نے ڈھانپ لیا تھا اور ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ سونے کے پتنگوں نے اُسے ڈھانپ لیا، موصول کو مبہم رکھنا سدرہ کو ڈھانپنے والی چیز کی عظمت وکثرت پر دلالت کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اُسے بیان نہیں فرمایا کہ وہ ایک راز ہے جسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور یہ بھی کہا گیا کہ اللہ کی قدرت وصفات کی انواع نے اس کو ڈھانپ لیا ہے جنہیں اللہ نے اس کے لئے اختراع فرمایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُسے مختلف رنگوں نے ڈھانپ لیا تھا۔مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا تھے۔یہ قول نبی ﷺ سے منسوب کیا گیا ہے۔حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ہے کہ یغشها نور الخلاق (خالق کے نور نے اُسے ڈھانپ رکھا تھا) حسن سے مروی ہے کہ غشيها نور رب العزت اور صوفیاء کا قول ہے کہ غشيها تجليات الله تعالىٰ .

(۱۷) **مَازَاغَ الْبَصَرُ** (ترجمہ:۔آنکھ کسی طرف مائل نہ ہوئی) یعنی نبی ﷺ کی چشم مبارک اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئی جس کی طرف وہ دیکھ رہے تھے۔حالانکہ انسانی آنکھ کا تقاضہ ہے کہ اندیکھی چیزوں کو دیکھتے وقت بھٹکے گی ضرور۔ **وَمَا طَغٰى** (ترجمہ:۔اور حد سے نہیں بڑھی) یعنی جسے دیکھا اس سے تجاوز نہیں کیا بلکہ اُسی پر صحیح طرح سے آپ کی نظر جم گئی۔اور یہ نبی ﷺ کی طرف سے شک کی نفی اور آپ کے رویت کے ثبوت کے طور پر فرمایا گیا ہے۔صوفیاء کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ کی نظر مبارک حق سے اس کی تجلیات کی طرف متجاوز نہیں ہوئی۔اور نہ ہی غیر کی طرف

(۱۸) **لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى** (ترجمہ:۔اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں) یعنی شان الوہیت وحدانیت اور انوارِ وحدت کے چہرے پر باریک حجابات میں سے تمثیلی صورتیں رکاوٹ نہ بن سکیں۔یہ دیدار نبی ﷺ سے مختص ہے اور اس میں کسی نبی مکرم اور رسول کا کوئی حصہ نہیں ہے۔اس لئے کہ شان اطلاق کے ساتھ رویت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں ایک ایسا معاملہ ہے کہ جن کا ادراک عقول نقیہ اور مدارک عالیہ نہیں کر سکتے سوائے ان کے جن پر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی ہو اور ان سے تعینات

کے پردے اٹھالئے ہوں اوران پر حقیقت اصلیہ ظاہر فرمائی ہو۔ جوکہ اس ذات لم یلد و لم یو لد کی شان رہی ہے۔ پس جسے اللہ تعالیٰ نے مقدس دیدار عطا فرمادیا اور اس لئے اللہ سبحانہ نے یہ اعلان کروایا۔ وما انا من المشر کین. اور جب مشرکوں نے اس حقیقت کے کشف کے بغیر اپنے بتوں کے لئے الٰہیت کا ہونا ثابت کیا تو اللہ نے فرمایا۔

(۱۹۔۲۰) اَفَرَءَ یْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی o وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی (ترجمہ: کیا آپ نے لات وعزّٰی اور ایک اور تیسری منات کو دیکھا) اس میں ہمزہ انکار کا ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم کفر کی پلیدی اور شرک کی نجاست میں ڈوبے رہنے کے ساتھ ساتھ الوہیت کے انوار کو اپنے بتوں میں دیکھ سکتے ہو۔ مشہور ہے کہ انہوں نے لفظ لات کو لفظ اللہ سے اور لفظ عزیٰ کو عزیز سے لفظ منات کو منان سے بنایا ہوا ہے اور ان کا ایسا کرنا یہ محض ان کی اپنے نفس کی طرف سے ہے عالم واقع میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بُت جمادات ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ نفع پہونچا سکتے ہیں تو ان کے اس حالت پر ہوتے ہوئے کون عاقل انہیں اللہ کا شریک تصور کرسکتا ہے۔

(۲۱) اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی (ترجمہ:۔ کیا تمہارا بیٹا ہے اور تمہاری بیٹی) یعنی جو چیز تم ناپسند کرتے ہو (لڑکی وغیرہ) اُسے تم اللہ کے لئے کیوں ٹھیراتے ہو اور اپنے لئے اپنی چاہت کے مطابق (لڑکے وغیرہ کو) کیوں ترجیح دیتے ہو اور کہا گیا ہے کہ مشرک کہا کرتے تے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں جبکہ بیٹیاں ان کے نزدیک حقیر سمجھی جاتی تھیں تو وہ انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اور لڑکوں کو اپنے لئے پسند کرتے تھے۔

(۲۲) تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (ترجمہ:۔ یہ تقسیم تو غیر منصفانہ ہے) یعنی حق اور عدل سے ہٹی ہوئی اور خارج تقسیم ہے، حسن فرماتے ہیں کہ (ضاز فی الحکم) کہنے کا مطلب ہے کہ اس نے ظلم کیا اور (ضازہ حَقَّہ') کے معنی ہیں اس کو گھٹا کے دیا اور گھٹیا دیا۔ کسائی کہتا ہے کہ ضَارَ یضزُ تعدی، ظلم اور کھوٹ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور بعض عرب ضیزیٰ ''بغیر ہمزہ'' کے پڑھتے ہیں اور اسی پر قُراء حضرات کا اجماع بھی ہے کچھ ضیزی و ضوُزی ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں جبکہ ان دونوں قراءتوں کو کسی نے بھی نہیں پڑھا ہے۔ ابن عرابی نے کہا ہے کہ عرب قِسمَۃٌ ضُوۡزِیٰ پیش و ہمزہ کے ساتھ اور ضوزیٰ بلا ہمزہ اور ضیزیٰ ہمزہ و کسر کے ساتھ اور ضیزیٰ بلا ہمزہ زیر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان سب کے معنی ہیں ''ظلم'' اور ضُئزیٰ بروزن فُعلٰی (فا پر پیش، عین ساکن) اور اگر پہلا حرف مکسور ہو مثلاً نیضٍ اور عینٍ یا اس کا پہلا مضموم ہو تو اسے اس کی حالت ضمّہ پر رکھنے کو ناپسند کیا ہے۔ اسی لئے بَوضٰ اور عَوَن'' کہا جاتا ہے جس کا واحد بیضاء اور عیناء۔ پھر ''ی'' کی مناسبت کی وجہ سے 'ب' کو زیر دے دیا۔ اسی طرح سے ضوزیٰ بھی کہنا ناپسند کرتے ہیں، جسے واؤ سے بدل دیا گیا ہے جبکہ وہ ''ی'' میں سے ہے۔ ابن سیدہ کہتے ہیں مونث کی نعت فَتح یا پیش کے ساتھ آتی ہے۔ مفتوح کی مثال سُکر عَطشی اور مضموم کی مثال حُبلٰی۔ اور جب اسم ہو نعت نہ ہو تو اس کے اول حرف پر زیر دی جاتی ہے مثلاً ذکریٰ اور شعریٰ۔ جوہری کہتا ہے کہ فعلیٰ صفت نہیں ہے یہ اسماء کی بناء میں سے ہے۔ شعریٰ اور دِفلٰی کی طرح

اسی طرح زجاج نے کہا ہے اور جب قِسمَۃٌ ضیزیٰ کہا جاتا ہے تو اس کے معنی قسمة جائرة ہوں گے اور اگر قسمة ضیزی اضافت کے ساتھ کہا جائے تو اس وقت اس کے معنی قسمة جور ہوں گے جیسے محمد بن اشعث کا قول ہے۔

فتلک قسمة ضیزیٰ قد سمعت بها و انت تبکنها ماذاک فی الدین.

(۲۳) **اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ** (ترجمہ:۔نہیں ہیں وہ مگر نام) یعنی بت محض نام ہی ہیں ان میں الوہیت کے کوئی معنی موجود نہیں ہیں جس کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ کیونکہ وہ جمادات ہیں جس میں کوئی حس، حرکت اور عقل نہیں ہے۔ اس لئے ان سے سننے، دیکھنے، نفع اور ضرر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ **سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ** (ترجمہ:۔جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھے ہیں) معنی یہ ہیں کہ وہ بُت محض نام ہی ہیں جو تم نے رکھے ہیں جبکہ ان ناموں پر دلالت کرنے والے مسمیات کا وجود ہی نہیں ہے۔ **مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا** (ترجمہ:۔اللہ نے ان کے متعلق نہیں نازل فرمایا) یعنی ان کے معبود ہونے کے بارے میں۔ **مِنۡ سُلۡطٰنٍ** (ترجمہ:۔کوئی دلیل) یعنی کسی قسم کی دلیل و حجت۔ **اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ** (ترجمہ:۔نہیں پیروی کرتے) اس کو یا اور تا دونوں سے (اِن یَتّبعون اور اِن تَتَّبِعُون) پڑھا گیا ہے۔ **اِلَّا الظَّنَّ** (ترجمہ:۔مگر گمان) یعنی یہ کافر اپنے تاریک قلوب کے اندر جمائے ہوئے خیالات و گمانوں کے علاوہ کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ تو محض باطل، وہم اور گمراہ کن خیالات ہیں جو انہیں آگ کی طرف گھسیٹ لے جائیں گے۔ **وَ مَا تَهۡوَی الۡاَنۡفُسُ** (ترجمہ:۔اور اس کی جس کے ان کے نفس خواہش کرتے ہیں) یعنی جس کی طرف ان کے نفسوں کا میلان ہوتا ہے اور خواہش کرتے ہیں۔ قمر منیر کی طرح روشن، حق کی طرف توجہ کے بغیر۔ **وَ لَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰی** (ترجمہ:۔یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے) اس سے مراد نبی ﷺ ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ پر نازل ہونے والی ظاہر کتاب کا واضح بیان مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور قرآن پہونچ چکے ہیں جو انہیں اللہ کی وحدانیت اور طریقہ ہائے عبادت کی تعلیم دیتے ہیں اور انہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ عبادت اللہ کے سوا کسی اور کے لئے صحیح نہیں ہے لیکن انہوں نے گمراہی کو پسند کرلیا اور باطل گمان اور خبیث نفس کے خواہش کی تابعداری اختیار کرلی ہے۔

(۲۴) **اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی** (ترجمہ:۔کیا انسان کو وہ حاصل ہوتا ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے) اَمۡ منقطع ہے اور "بل" مقدر ہے اس میں انکار ہے اس چیز کے حصول سے جس کی وہ بتوں سے تمنا کرتے ہیں کہ وہ انہیں نفع پہونچائیں گے اور شفاعت فراہم کریں گے۔ یہ آرزو محض باطل وہم ہے کیونکہ انسان اپنے نفس میں وجود دینے والے ھستی کا مکمل طور پر محتاج ہے جو اُسے عدم سے وجود کی طرف لائے، اُسے رزق دے، اس کو ایک مقرر مدت تک تحفظ دے تو وہ اپنے وجود اور بقاء کے لئے وجود دینے والی اور باقی رکھنے والی ہستی کا محتاج ہے تو پھر اُسے کیونکر ہوسکتی ہے تمنائیں جو اللہ کے علم و ارادے میں مقدر ہی نہیں ہیں اس لئے اللہ نے فرمایا۔

(۲۵) **فَلِلّٰهِ الۡاٰخِرَةُ وَالۡاُوۡلٰی** (ترجمہ:۔اللہ کے لئے دنیا و آخرت ہے)۔ یعنی دنیا و آخرت میں ہونے والی تمام

امور پس اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر امیدیں بر نہیں آ سکتیں۔

(۲۶) **وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا** (ترجمہ:۔آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی شفاعت کچھ کام نہیں آ سکے گی) کم خبر یہ ہے اور اس کے معنی تکثیر کے ہیں اس لئے ضمیر جمع کی استعمال کی گئی ہے معنی یہ ہیں کہ آسمانی فرشتے اپنی طہارت اور عبادت کے اور اللہ کے نزدیک اپنی کرامت اور اپنی عبادت میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کے حکم کردہ امور کی سرانجام دہی میں مبادرت اور اللہ کی بارگاہ میں حضوری کے باوجود شفاعت پر قادر نہیں ہوں گے۔ **اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ** (ترجمہ:۔مگر اللہ کے اجازت دینے کے بعد) یعنی شفاعت کے متعلق اذن ملنے کے بعد۔ **لِمَنْ يَّشَآءُ** (ترجمہ:۔جس کے لئے اللہ چاہے گا) کہ وہ اس کی شفاعت کریں۔ **وَيَرْضٰى** (ترجمہ:۔اور پسند فرمائے گا) ان کے لئے شفاعت کو اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور موحد ہونے کی وجہ سے۔ اس میں اللہ کی ذات کے ساتھ شرک کرنے والے اور اس کی اطاعت اور اس کے رسول کی اتباع سے روگردانی کرنے والے کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کفر اور شقاوت اللہ کے علم کے مطابق سبقت کر چکا ہے اور وہ اللہ کے ازلی علم کے مطابق دوزخی ہیں، لہذا ان کے لئے اللہ کا کوئی بھی بندہ شفاعت نہیں کرے گا۔ اس آیت سے ظاہر ہوا کہ ملائکہ گنہگاروں کے لئے شفاعت کریں گے جس طرح انبیاءؑ شفاعت کریں گے۔ اور شفاعت کا مبدا قلب کی رقت اور مجبور انسان کو کرب و تکلیف میں عاجز و مبتلا دیکھ کر اور اپنے سے اس کرب و بلا کو ہٹانے کی طاقت نہ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فرشتہ میں دو قوتیں ہوتی ہیں، فعلیہ اور انفعالیہ۔ لہذا حکماء کا یہ قول کہ بسیط ذات سے ایک شئے صادر ہوتی ہے، باطل ہوا۔ یہ تقریر اللہ کی بعض صفات مثلاً رحمت و رافتہ وغیرہما میں بھی جاری ہوتی ہیں۔

(۲۷) **اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ** (ترجمہ:۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے نام رکھتے ہیں) جو کہ ہر نقص، ہر عیب سے پاک ہوتے ہیں۔ **تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى** (ترجمہ:۔عورتوں کے نام) یہ تفریط مشرکوں کی بیوقوفی اور ان کی جہالت کی وجہ سے ہے اس لئے کہ جب ملائکہ کو ''ۃ'' کے ساتھ استعمال کرتے تھے تو یہ گمان کرتے تھے کہ وہ عورتیں ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

(۲۸) **وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ** (ترجمہ:۔حالانکہ انہیں اس کا بالکل کچھ علم نہیں ہے) یعنی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے کہے ہوئے کو خود بھی نہیں جانتے اس لئے کہ وہ مَلَک کی حقیقت کو نہیں جانتے اور نہ ہی انہوں نے خبر کے ذریعہ سے ان کے احوال ہی سنے ہیں **اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ** (ترجمہ:۔نہیں تابعداری کرتے) یہاں پر ''ان'' نافیہ ہے۔ **اِلَّا الظَّنَّ** (ترجمہ:۔مگر گمان کی) اس سے مراد ان کے جاہل آباء کی باتیں ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی راہ راست پر تھے۔ **وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا** (ترجمہ:۔اور بے شک حق کے مقابلے میں گمان کچھ کام نہیں دیتا) اور حق یقینی علم ہے۔ گمان سے عقائد اور معارف یقینیہ کے متعلق دلیل نہیں قائم کی جا سکتی تو پھر اس قسم کے گمان کو جو کہ محض وہم باطل اور زعم فاسد ہی ہے اور شیطان کے وساوس سے پیدا ہوا ہے کیونکہ یقین کا

درجہ دیا جاسکتا ہے۔

(۲۹) **فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی** (ترجمہ:۔تو منہ پھیرنے والے سے آپ گریز کریں) کیونکہ اس نے ردگردانی کی۔ **عَنْ ذِكْرِنَا** (ترجمہ:۔ہمارے ذکر سے) وہ ہے قرآن مجید۔بعض علماء نے کہا کہ یہ آیت، آیت قتال سے منسوخ ہے اور یہ ضعیف قول ہے کیونکہ اعراض، قتال سے مختلف نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اعراض سے خاص ہے۔**وَلَمْ يُرِدْ** (ترجمہ:۔اور اس نے نہیں چاہا) اس رد گردانی کرنے والے نے۔ **اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا** (ترجمہ:۔مگر دنیا کی زندگی کو) اور اس کی نگاہ اُسی پر قاصر رہی۔

(۳۰) **ذٰلِكَ** (ترجمہ:۔یہ) یعنی دنیا کی زندگی پر قاصر رہنا اور اس میں منہمک رہنا اور اس کی محبت رکھنا۔ **مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ** (ترجمہ:۔یہی ان کے علم کی انتہا ہے)۔فراء کہتا ہے کہ یہ اُن کے عقل اور علم کی انتہا ہے۔وہ ہے دنیا کو ترجیح دینا۔ **اِنَّ رَبَّكَ وَهُوَ اَعْلَمُ به بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ** (ترجمہ:۔بے شک آپ کا رب اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گیا) جیسے کہ یہ مشرک۔**وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى** (ترجمہ:۔اور وہ خوب جانتا ہے جس نے ہدایت قبول کی) جیسے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے لوگ۔

(۳۱) **وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَافِى الْاَرْضِ** (ترجمہ:۔اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمینوں میں ہے) ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے۔ **لِيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اَسَآءُ وْا بِمَا عَمِلُوْا** (ترجمہ:۔تا کہ بُرائی کرنے والوں کو بدلہ دے) یعنی انہیں بُرائی اور بے حیائی کرنے پر عذاب دے۔ "بما عملوا" میں "بہ" سبب کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ہدایت پذیر اور گمراہ شخص کو آگاہ فرمادیا اور ہدایت و گمرہی کے درمیان تمیز فرمادی پھر وہ بدکار لوگوں کو ان کے بُرے عمل کے برابر ہی جزا دے گا اس سے زیادہ نہیں۔ **وَيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا** (ترجمہ:۔اور نیکی کرنے والوں کو بدلہ دے) یعنی جن لوگوں نے نیکیاں کیں۔ **بِالْحُسْنٰى** (ترجمہ:۔اچھا) ثواب یا جنت۔

(۳۲) **اَلَّذِيْنَ** (ترجمہ:۔جو) وہ لوگ جو **يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ** (ترجمہ:۔کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں) کبیرہ ہر اُس گناہ کو کہا جاتا ہے جس پر وعید سنائی گئی ہو۔ **وَالْفَوَاحِشَ** (ترجمہ:۔اور بے حیائی کے کاموں سے) یہ فاحشہ کی جمع ہے اس سے مراد زنا ہے۔بیضاوی کا کہنا ہے یعنی کہ بے حیائی کے بڑے بڑے ظاہر کام۔حمزہ، کسائی اور خلف نے "كبير الاثم" پڑھا ہے اور انہوں نے اس سے جنس مراد لی ہے۔ **اِلَّا اللَّمَمَ** (ترجمہ: ہلکے گناہ کے سوا) یعنی قلیل اور صغیر گناہوں کے علاوہ، کیونکہ وہ کبائر سے اجتناب کرنے والے کے لئے معاف ہوتا ہے اس میں استثناء منقطع ہے۔اور الذین کو صفت یا مدح کی وجہ سے حالت نصب میں رکھنا جائز ہے۔ **اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ** (ترجمہ:۔بے شک تیرا رب وسیع مغفرۃ والا ہے) کیونکہ وہ کبائر سے اجتناب کی وجہ سے صغیرہ گناہ کو معاف فرمادیتا ہے اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں کو توبہ کی وجہ معاف فرمادیتا ہے یا وسیع فضل و رحمت کی وجہ سے بغیر توبہ کے بھی معاف فرمادیتا ہے۔اسی وجہ سے اہل السنۃ کا کہنا ہے کہ گناہگاروں کو عذاب دینا اللہ پر لازم نہیں۔ **هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ** (ترجمہ:۔وہ

اسے خوب جانتا ہے) بکم معنی منکم ہے ۔ **اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ** (ترجمہ:۔ جب اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے شکم میں حمل کی صورت میں تھے) یعنی جب اس نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں میں صورت بخشی کیونکہ وہ کلی اور جزوی طور پر تمام علوم اور احوال کو جانتا ہے۔ **فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى** (ترجمہ:۔ تم اپنی پاکیزگی کا دعویٰ مت کرو، وہ پرہیز گاروں کو خوب جانتا ہے) یعنی زیادتی خیر اور طہارت عمل کے ذریعہ اپنی ستائش مت کرو۔ اس لئے کہ وہ تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ اور وہ سب سے بڑے متقی و پرہیز گار کو پہچانتا ہے۔

(۳۳) **اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰى** (ترجمہ:۔ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے روگردانی کی) حق کی اتباع سے۔

(۳۴) **وَاَعْطٰى قَلِیْلًا وَّ اَكْدٰى** (ترجمہ:۔ اس نے تھوڑا دیا اور روک لیا) کد کہ معنی ہیں روکنا۔ مروی ہے کہ نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے مال سے تھوڑا دیا اور بیشتر حصہ روک کے رکھا اور پھر اس پر احسان جتانے لگا۔ ابن اعرابی کہتا ہے کہ ''اکدیٰ'' کے معنی ہیں دولت مندی کے بعد محتاج ہوا۔ اکدیٰ کے معنی ہیں **قمی خلقه** (بدخو ہو گیا) زجاج کہتا ہے کہ اکدیٰ کے معنی ہیں قطع۔ اس کی اصل کنویں میں کھدائی سے ہے۔ کنویں کھودنے والے کے لئے کہا جاتا ہے کہ جبکہ وہ ایسے پتھر تک پہونچ جائے جس کا کھودنا ممکن نہ ہو تو کہتے ہیں **قد بلغ الكدية** اور کھدائی موقوف ہو جاتی ہے (یعنی اس نے موقوف کر دیا) مروی ہے کہ حضرت فاطمہؑ اپنے بعض پڑوسیوں کی تعزیت کے لئے گئیں جب لوٹ کے آئیں تو سرکار ﷺ نے فرمایا **لعلک بلغت معهم الکدیٰ** (شاید آپ ان کے ساتھ کدیٰ تک گئیں) یہاں آنحضرت کی مراد کدی سے مقابر ہیں کیونکہ ان کے مقابر پتھریلے مقام پر تھے۔ کدیٰ ''کُدیة'' کی جمع ہے اور حدیث خندق میں ہے کہ **فعرضت فيه كدية فاخذ المسحاة ثم سمیٰ و ضرب** (اس میں دوران کھدائی ایک چٹان آ گئی تو آپ ﷺ نے کدال اٹھائی، اللہ کا نام لیا اور ضرب لگائی)۔ فراء کہتا ہے کہ اکدیٰ معنی ہیں عطیہ دینے سے رُک گیا اور تعلق توڑ لیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں **قَلَّ خیره** (اس کی بھلائی کم ہو گئی) اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت مبارکہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا یعنی تابعداری کرتا تھا جس پر بعض مشرکوں نے غیرت دلائی اور کہا کہ تو نے اپنے بڑوں کا دین چھوڑ دیا اور گمراہ ہو گیا ہے تو اس نے اس پر کہا کہ مجھے اللہ کے عذاب سے ڈر لگتا ہے تو اس مشرک نے اس سے اُس عذاب کا ذمہ لے لیا۔ اس شرط پر کہ اگر وہ اُسے اپنا کچھ مال دیدے جس پر ولید بن مغیرہ مرتد ہو گیا اور اس نے مشروط مال کا کچھ حصہ دے دیا لیکن باقی دینے سے رک گیا۔

(۳۵) **اَعِنْدَهٗ** (ترجمہ:۔ کیا اس کے پاس) یعنی عذاب کی ضمانت دینے والے اس مشرک کے پاس **عِلْمُ الْغَیْبِ فَهُوَ یَرٰى** (ترجمہ:۔ غیب کا علم ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے) معنی یہ ہیں کہ عذاب کے معاملے میں سے جو کچھ غائب ہے اس مشرک کے پاس اُس کا علم ہے کہ وہ اُسے جانتا ہے۔

(۳۶۔۳۷) **اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ** (ترجمہ:۔ کیا اُسے آگاہ نہیں کیا گیا) یعنی کیا اُسے خبر نہیں دی گئی۔ **بِمَا فِیْ صُحُفِ**

مُوْسٰی o وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (ترجمہ:۔اس چیز کی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم جو پوری طرح احکام بجالائے) یعنی اس نے اپنی قوم کو پہونچا دیا جس کا انہیں اللہ نے صحیفوں میں علم دیا تھا اور جس کا ان سے اللہ نے عہد لیا تھا اس کے پورے کرنے میں مبالغہ سے کام لیا۔خصوصی طور پر ان دونوں کا ذکر اسی لئے کیا گیا اور موسیٰ ؑ کا ذکر مقدم ہے اس لئے کہ عرب یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے۔موسیٰ ؑ کے احوال کو جانتے تھے ان کے قصّے اُن کی شریعت اور ان کی کتاب ان کے یہاں جانے پہچانے تھے اور بعض عرب تو یہودیوں کے ساتھ انسیت کی وجہ سے یہودی بھی ہوگئے تھے۔اور دم اس وجہ سے بھی کہ ابراہیمؑ کے بہ نسبت موسیٰ ؑ کا عہد مبارکہ قریب ہی تھا اور ابراہیمؑ کا ذکر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ وہ مصائب مشکلات برداشت کیں جو کسی غیر نے برداشت نہیں کیں۔مثلاً نار نمرود پر آپ کا صبر، یہاں تک آگ میں پھینکے جاتے وقت حضرت جبرئیل آئے اور پوچھا کیا آپ کو کوئی حاجت پیش ہے تو آپ نے فرمایا ہاں لیکن تجھ سے نہیں تو اللہ تعالیٰ ”یا نار کونی برداو سلاماً علی ابراهیم کے فرمان کے ذریعہ آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔اور آپ نے اپنے بیٹے کو ذبح کر ڈالا تو اللہ نے فضل فرمایا اور ایک مینڈھا اس کے فدیہ میں عطا فرمادیا اور روزانہ ایک فرسخ (تین میل) مہمان کو تلاش کرنے کے لئے نکل جاتے تھے اگر وہ مل جاتا تو آپ اس کی آؤ بھگت کرتے ورنہ آپ روزہ کی نیت کر لیتے۔معنی یہ ہیں کہ اس روکنے والے بخیل شخص کو موسیٰ ؑ اور ابراہیمؑ کی شریعتوں کے متعلق کوئی خبر نہیں پہونچی ہے باوجودیکہ وہ ان کے نزدیک مشہور و معروف ہیں اور ان دونوں شریعتوں میں یہ مذکور ہے کہ

(۳۸) اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (ترجمہ:۔کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔اَن ثقلیہ سے مخففہ بنائی گئی ہے اور ”بما فی صحف موسیٰ ؑ“ کے اندر ما کا بدل ہے اور محل جر میں ہے یا ھوا کے مقدر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔معنی یہ ہے کہ کسی کو بھی دوسرے کے گناہ میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا یہ حکم ابراہیمؑ کے صحیفے میں اور توریت میں مذکور تھا۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کسی شخص کو کسی دوسرے کے گناہ میں پکڑ لیتے تھے پھر اُسے اس کے باپ یا بیٹے یا اس کے بھائی یا اس کی بیوی یا اس کے غلام کے بدلے قتل کر دیتے تھے پھر انہیں ابراہیم ؑ نے اس عمل سے روکا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم ارشاد فرمایا۔

(۳۹) وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (ترجمہ:۔اور انسان کے لئے نہیں مگر جو اس نے کوشش کی) یہ حکم بھی حضرت موسیٰ ؑ اور ابراہیمؑ کے صحائف کے احکامات ہی میں سے ہے۔معنی یہ ہیں کہ انسان کو صرف اس کی کوشش کا اجر اور عمل کی جزا ملے گی۔کسی بھی ایک دوسرے کی سعی فائدہ و نفع نہ دے گی جب اس قسم کے احکام لوگوں میں مقبول و مشہور ہیں تو کوئی بھی کسی دوسرے سے اس کے عذاب کے لئے کیونکر ضامن ہوسکتا ہے یا بدلہ بن سکتا ہے۔پس جو کچھ مشرکوں نے ولید بن مغرہ سے کہا تھا کہ وہ اس کے عذاب کے کفیل بنتے ہیں، ان کا یہ کہنا غیر معقول قول تھا اور خود ولید کا اس بات پر اعتبار کرنا اس کی جہالت و حماقت تھی یہ تو وہ کچھ ہے جو کہ موسیٰ ؑ و ابراہیمؑ کے صحائف میں مذکور ہے۔البتہ ہمارے نبی ﷺ کی شریعت میں انسان کو غیر کی سعی نفع پہونچاتی ہے۔اس میں سے شفاعت واللہ

کا فضل اوراس کی رحمت بھی ہے جہاں تک کہ انسان کو غیر کے سعی کے نفع پہونچانے کا معاملہ ہے تو وہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جیسے کہ ہم عنقریب انشاءاللہ ذکر کریں۔ امام نجم الدین نسفی نے ''عقائد'' کے اندراور **"دعاء الاحیاء لاموات و صدقتهم عن هم"** میں فرمایا ہے کہ انہیں اس کا فائدہ ہوتا ہے اور علامہ تفتازانی نے اس کی شرح میں فرمایا ہے کہ ہمارے لئے وہ صحیح احادیث ہیں جن میں اموات کے لئے دعا کا ذکر ہے۔ خصوصاً نماز جنازہ میں اور یہ سلف سے بھی متواتراً مشہور ہے۔ اگراس میں اموات کے لئے فائدہ نہ ہوتا تو اس دعا کا کوئی معنی نہ ہوتا اور نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کسی مسلمان میّت پر سو مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وہ سب کے سب اس کے لئے شفاعت کرتے ہیں تو وہ قبول کی جاتی ہے اور سعد بن عبادۃ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ سعد کی والدہ فوت ہوگئی پس کونسا صدقہ افضل ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ پانی، تو اس نے کنویں کھدوایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سعد کی ماں کے لئے ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دعا بلاء کو ٹالتی ہے اور صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ عالم اور متعلم جب کسی بستی پر سے گزرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس بستی کے قبرستان والوں سے چالیس دن تک عذاب اٹھالیتا ہے اور اس بارے میں احادیث وآثار بے شمار ہیں۔ ملاعلی قاری نے ''فقہ اکبر'' کی شرح میں فرمایا ہے کہ یہ عمل سلف صالحین سے ورثہ میں چلا آرہا ہے اور خلف کا اس پر اجماع بھی ہے۔ پس اگراس میں مرے ہوئے لوگوں کے لئے نفع نہیں ہے تو یقیناً یہ کام عبث ہی ہے پھر اس کے بعد ملاعلی قاری نے ذکر کیا ہے کہ عقیدہ طحاویہ کے شارح نے فرمایا ہے کہ اہل السنّت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرے ہوئے کو زندہ لوگوں کی سعی عمل سے دو وجوہ سے نفع حاصل ہوتا ہے ایک تو یہ کہ خود مرنے والا ان کاموں کا سبب تھا، دوسرا مسلمانوں کا اس کے لئے دعا و استغفار، صدقہ اور حج کے ثواب کے پہونچنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانی سے مروی ہے کہ حاجی کے حج اور نفقہ کا ثواب میّت کو پہونچتا ہے۔ عام علماء کے نزدیک بھی حج کا ثواب اُسی کو پہونچتا ہے جس کی طرف سے حج کیا جاتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ شیخ سیوطی نے ''شرح الصدور'' میں فرمایا ہے اور انہوں نے کئی لوگوں سے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ دُعا میت کو فائدہ دیتی ہے۔ اور اس کی دلیل قرآن پاک میں یہ ارشاد الٰہی ہے کہ **والذین جاء ؤ من بعد هم يقولون ربنا غفرلنا ولا خواننا الذين سبقونا بالايمان۔ (الحشر ۱۰)** اور ابن قیم نے کہا ہے کہ قراءۃ، نماز، صدقہ اور حج وغیرہ کا ثواب مرنے والوں کو ہدیہ کیا جاتا ہے تو وہ ان تک پہونچتا ہے اور اس قسم کی خبروں میں بڑا تواتر ہے۔ اگر ہم اپنے دور کے لوگوں اور پچھلے اصحاب سے پہونچی ہوئی باتوں کو ذکر کریں گے تو بات بہت طویل ہوجائے گی۔ صاحب ھدایہ نے کہا ہے کہ اس بحث سے متعلق اصل بات یہ ہے کہ انسان کو اپنے عمل یعنی نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کے ثواب کو غیر کو منتقل کرنا اہل سنت والجماعت کے نزدیک حق ہے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ اس بارے میں بہت سی روایات ہیں ان میں سے ایک روایت صحیح مسلم شریف میں حضرت جریر بن عبداللہ سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اور اس کے بعد عمل کرنے والوں کا بھی اجر ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں سے کچھ کم کیا جائے اور جس کسی نے اسلام میں بُرا طریقہ ایجاد کیا تو اس پر اس کا وبال ہوگا اور اس کے بعد عمل کرنے

والوں کا بھی وبال ہوگا سوائے اس کے ان کے وبال میں سے کچھ بھی کم کیا جائے اور دوسری حدیث اس بارے میں امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں حضرت حذیفہ سے لائے ہیں آپ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوال کیا تو قوم دینے سے رکی رہی، اتنے میں ایک شخص نے پہل کی اُسے کچھ دیدیا تو قوم نے بھی دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اچھا طریقہ ایجاد کیا اور اس پر عمل کیا تو اُسے اس کا اور اس کے بعد والوں میں سے اس کی تابعداری کرنے والوں کا اجر ملے گا ان کے ثواب سے کمی کئے بغیر۔ اور جس کسی نے برا طریقہ ایجاد کیا اور عمل کیا تو اس پر اس کا اور بعد والوں میں سے تابعداری کرنے والوں کا گناہ ہوگا ان کے گناہوں میں سے کمی کئے بغیر اور اس کے متعلق ابن ماجہ ابو ہریرہؓ سے روایت لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی پاک ﷺ کے پاس آیا پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو آمادہ کیا (لوگوں نے خوب دیا) تو اس شخص نے کہا کہ میرے پاس اتنا اتنا ہوگیا۔ راوی کہتا ہے مجلس میں کوئی بھی نہ تھا جس نے اُسے کم وبیش صدقہ نہ دیا ہو۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے بھی اچھا طریقہ شروع کیا پھر اس پر عمل بھی کیا تو اُسے کامل اجر ملے گا اور اس طریقہ پر پیروی کرنے والوں کا بھی اجر ملے گا اور ان پیروی کرنے والوں کے اجر میں سے کچھ بھی کم نہ ہوگا اور جس کسی نے بُرا طریقہ ایجاد کیا پھر اس پر عمل کیا تو اس پر پورا پورا گناہ ہوگا اور اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کا بھی گناہ ہوگا اور ان لوگوں کے گناہوں میں سے کچھ کم نہ ہوگا۔ بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں روایت نقل کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مرجائے اور اس پر ذمہ روزے رہ گئے ہوں تو اس کی طرف سے اس کے وارث روزہ رکھ لیں، نیز ان دونوں نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نبی پاک ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا میری ماں فوت ہوگئی ہے اور ان پر ایک ماہ کے روزے تھے تو کیا میں اُن کی طرف سے روزہ رکھ لوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں'' اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ کا قرض ادا کئے جانے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ اسی بارے میں مسلم میں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ اپنی والدہ کو ایک باندی بطور صدقہ دی تھی اور ماں مرگئی ہے تو آپ نے فرمایا کہ تیرا ثواب ثابت ہو چکا تو اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس پر ایک ماہ کے روزے بھی تھے کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے روزہ رکھ۔ پھر اس نے کہا یا رسول اللہ اس نے کبھی حج بھی نہیں کیا تھا تو کیا میں اس کی طرف سے حج بھی کروں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے حج کر۔ اس بارے میں ابن عبدالبر نے کہا ہے نبی پاک ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی مرجائے اور اُس کے ذمہ روزہ ہوں تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزہ رکھے۔ اسی بارے میں ابن ماجہ اپنی ''سنن'' میں ابن عمرؓ سے روایت لائے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو شخص مرجائے اور اس کے ذمے مہینے بھر کے روزے ہوں تو ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ ترمذی نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے اور اسی بارے میں ابوداؤد اپنی سنن میں ابن عباسؓ سے روایت لائے ہیں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص رمضان میں مریض ہوجائے اور صحت حاصل ہونے سے پہلے مرجائے تو اس کی طرف سے کھانا کھلا دیا جائے تو اس کے ذمہ قضا نہ رہے گی اور اگر اس نے منت مانی تھی تو اس کی طرف سے

اس کے وارث روزہ رکھ لیں۔

مسلم نے اپنی صحیح میں ابوھریرہؓ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کا ہر عمل منقطع ہو جاتا ہے البتہ تین عمل منقطع نہیں ہوتے۔(۱) صدقہ (۲) علم جس سے نفع اٹھایا جاتا ہو (۳) اولاد صالح جو اس کے لئے دعا کررہی ہو۔

اس بارے میں ابن ماجہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت لائے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مومن کو اس کے عمل اور نیکیوں کا ثواب اس کی موت کے بعد بھی پہونچتا رہتا ہے مثلاً اس نے کسی کو علم سکھایا ہو اور اس کو عام کیا ہو۔ یا صالح اولاد چھوڑی ہو یا مصحف شریف کا کسی کو وارث بنایا ہو یا مسجد بنائی ہو یا مسافر خانہ بنوایا ہو، یا نہر کھدوائی ہو یا اپنی حیات وصحت میں اپنے مال میں سے صدقہ نکالا تو اُن تمام چیزوں کا ثواب اس کی موت کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ امام احمد اپنی مسند میں ابوامامہؓ کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کا قول نقل کرتے ہیں کہ چار لوگوں کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے (۱) اللہ کی راہ میں مرابط شخص (۲) علم سکھانے والا آدمی (۳) صدقہ کرنے والا آدمی۔ ان کا اجر انہیں ملے گا اور (۴) صالح اولاد جو اس نے چھوڑی ہو اور وہ ان کے لئے دعا کررہی ہو۔ اسی بارے میں ابونعیم اور بزار حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات چیزیں ہیں جن کا اجر مرنے کے بعد بھی اس کی قبر میں ملتا رہتا ہے (۱) کسی کو علم سکھایا ہو (۲) نہر جاری کی ہو (۳) کنواں کھدوایا ہو (۴) کھجور کا درخت لگایا ہو (۵) مسجد بنوائی ہو (۶) مصحف شریف کا کسی کو وارث بنایا ہو (۷) اولاد چھوڑی ہو جو مرنے والے کے لئے دعا کرتی ہو۔ اس بارے میں بے شمار روایات ہیں جن کا اندازہ ناممکن ہے اور وہ سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ میت کو دوسرے کے عمل کا ثواب پہنچتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے جیسا کہ امام محمد نے کتاب الآ ثار میں ذکر کیا ہے کہ ابوحنیفہ حضرت حماد سے اور وہ حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ تین چیزیں ہیں جن کا مرنے کے بعد میت کو ثواب ملتا ہے (۱) بیٹا جو موت کے بعد دعا کرتا ہو اس کی دعا کی وجہ سے اس کو بھی اجر ملے گا (۲) جس کسی نے کسی کو علم سکھایا ہو وہ اس پر عمل کرتا ہو اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو تو اس کو عمل کرنے اور تعلیم دینے کا اجر ملتا رہے گا اور (۳) وہ آدمی کہ جس نے زمین بطور صدقہ چھوڑی ہو۔ سلف وخلف کا اس پر اجماع ہے کہ میت کو غیر کے عمل کا ثواب ونفع ملتا ہے اور اس بارے میں اجماع ہے کہ نبی پاک ﷺ میدان حشر میں لوگوں کے لئے شفاعت فرمائیں گے اور آپ ﷺ جنت میں داخلہ کے لئے جنتیوں کی بھی سفارش فرمائیں گے۔ اسی طرح بطور نص یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ ملائکہ مومنوں کے لئے استغفار کرتے ہیں اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ میت کو غیر کا عمل فائدہ دیتا ہے۔ اس آیت کی توجیح کے بارے میں کئی اقوال ہیں پہلا قول وہ ہے جس کی تائید ابن عباسؓ نے بھی کی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ "والذین آمنوا واتبعتھم ذریتھم" کا ارشاد ربانی موجود ہے تو اللہ تعالیٰ صالح والدین کی وجہ سے بیٹوں کو بھی جنت میں داخل فرمائے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ انسان سے مراد یہاں کافر انسان ہے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ کافر شخص نے دُنیا میں جو بھی خیر کا کام کیا تھا اسے اس کا ثواب دنیا ہی میں دے دیا جائے گا۔ وہ اس

طرح کہ اس پر رزق وسیع کر دیا جائے اور تندرستی عطا کر دی جائے گی۔ یہاں تک کہ اس کے لئے آخرت کے واسطے کوئی بھی سعادت باقی نہیں رہے گی۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اللہ کے عدل و انصاف کے بیان کے بارے میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے اعتبار سے انسان کے وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے خیرات وحسنات میں بہتری اور اضافہ کی سعی کی ہوگی لیکن اللہ کے فضل و رحمت کے اعتبار سے انسان کے سعیٔ عمل سے زیادہ اجر عظیم اور ثواب جزیل کی عطاء بالکل جائز ہے اور یہ سب سے بہترین توضیح ہے۔

(۴۰) **وَاَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى** (ترجمہ:۔اور یقیناً اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی) یعنی آخرۃ میں میزان میں اس کا عمل عنقریب دیکھا جائے گا۔

(۴۱) **ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى** (ترجمہ:۔ پھر اُسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا) اخفش کہتا ہے کہ "**جزئية الجزاء**" اور "**جزية بالجزاء**" دونوں طرح سے کہنا برابر ہے ان میں کوئی فرق نہیں۔ "**الجزاء الاوفى**" مکمل جزاء اور یہ کمال اللہ کے فضل و رحمت کے طفیل ہے۔ البتہ اس کے عدل کے اعتبار سے انسان کا کوئی بھی عمل جزا کا مستحق ہی نہیں۔ چونکہ عمل فاسد قسم کے شبہات اور باطل قسم کے خطرات ووساوس سے مخلوط ومملو ہوتا ہے۔

(۴۲) **وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى** (ترجمہ:۔ تیرے رب ہی کی طرف پہونچتا ہے) یعنی اللہ کی طرف لوٹنا ہے کسی دوسری کی طرف نہیں۔

(۴۳۔۴۴) **وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰىo وَ اَنَّهٗ هُوَاَمَاتَ وَ اَحْيَا** (ترجمہ:۔اور یقیناً اسی نے ہنسایا اسی نے رلایا۔ اور بے شک اسی نے مارا اور اسی نے جلایا) یعنی وہی ہنسانے اور رلانے والا ہے اور وہی مارنے اور جلانے والا ہے۔ اسی سے ابی صخر ھذلی کا قول ہے کہ وہی ذات ہے جو ہنساتی اور رلاتی ہے اور وہی ذات ہے کہ جو مارتی اور جلاتی ہے اور وہی ذات ہے جس نے اپنے حکم کو جاری فرمایا ہے۔

(۴۵۔۴۶) **وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ** (ترجمہ:۔ اور یقیناً اس نے پیدا کئے جوڑے) ہر حیوان میں سے۔ **الذَّكَرَوَالْاُ نْثٰىo مِنْ نُّطْفَةٍ** (ترجمہ:۔نر اور مادہ نطفے سے) یعنی منی سے اس سے آدم وحوا کی اولاد مراد ہے کیونکہ آدم وحوا نطفہ سے پیدا نہیں کئے گئے تھے۔ **اِذَا تُمْنٰى** (ترجمہ:۔ جب ٹپکایا جائے) یعنی رحم میں ڈالا جائے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ جب تم اس پر قادر ہو۔ منیت الشئی ۔جب آپ کسی چیز پر قادر ہو تو یہ کہتے ہیں۔ و منی لہ اس وقت بولا جائے گا جب کسی چیز پر قادر ہوگا۔

(۴۷) **وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى** (ترجمہ:۔اور یہ کہ دوسری زندگی عطا فرمانا اسی پر ہے) یعنی دوبارہ زندہ کرتے وقت ارواح کو اجسام میں لوٹانا اور نشاۃ کو "مَدَّ" کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(۴۸) **وَاَنَّهٗ هُوَاَ غْنٰى وَ اَقْنٰى** (ترجمہ:۔اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا اور مفلس کرتا ہے) کہا گیا ہے کہ یعنی جسے چاہا غنی کیا اور جسے چاہا اُسے محتاج کر دیا۔ یہی اخفش اور ابن کیسان کا قول ہے۔ ابواسحاق نے کہا ہے کہ اقنی کے بارے میں دو قول ہیں

ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ اقنیٰ بمعنی ارضٰی کے ہیں اور دوسرا بمعنی جعل قینة ہیں یعنی اس نے اس کے لئے غناء کو اصل اور ثابت فرمایا اسی میں سے ہے کہ اقتنت کذا و کذا میں نے اس اس طرح سے اُسے نوازا۔ فرا کا قول ہے کہ اغنی کے معنی ہیں فقیر انسان اُسے غنی کرنے والے چیزوں کو پسند کیا۔ اقنی من قینة کے معنی ہیں اور اس نے تنگدستی اور پستی سے بے نیاز کر دیا۔ ابن اعرابی کہتا ہے کہ اقنیٰ کا مطلب ہے اس کو وہ کچھ عطا فرمایا جسے کفایت کے بعد وہ ذخیرہ بھی کر سکے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ (آقنی من الغناء) اس نے مجھے غنا سے بھی بے نیاز کر دیا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اغنی کے معنی ہیں ارضٰی (اس نے نہال کر دیا) اور اقنی کے معنی ہیں موّن (اُسے ذلیل و رسوا کر دیا ہے)

(۴۹) **وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى** (ترجمہ:۔ اور یہ کہ وہ شعریٰ کا رب ہے) وہ ستارے ہیں۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت بنو خزاعۃ کے حق میں نازل ہوئی تھی وہ شعریٰ کو پوجتے تھے یہ وہ ستارے ہیں جو جوزا کے پیچھے آتے ہیں اور یہاں پر شعری سے مراد عبور ہے جو روشنی میں شعری سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور جسے غمیصاء کہا جاتا ہے۔ یہاں خاص طور پر اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ شعری کو معبود سمجھنے والوں کا رد مقصود ہے جبکہ اللہ تو ہر شئے کا رب ہے۔ یہ ستارے آسمان کے اندر طول میں حرکت کرتے ہیں اور دوسرے کواکب اس کو چوڑائی میں کاٹتے ہیں۔ اُسے ابو کبشۃ نے دیکھا تھا اور وہ عرب کا معزز شخص تھا تو اُس نے اس کی عبادت کی اور اس کی عبادت میں موافقت کی قضاعۃ اور حمیر قبیلوں نے اور اس کے اور دوسرے قبائل کے درمیان اسباب دوستی ختم ہو گئے۔ وہ نبی ﷺ کے ننھیال میں سے تھا اسی لئے قریش رسول اللہ ﷺ کو کہتے تھے کہ یہ تو ابو کبشۃ کا بیٹا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تھی اور ابو کبشۃ کی طرح ان کے دین کی مخالفت کی تھی۔

(۵۰) **وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَنِ الْاُوْلٰى** (ترجمہ:۔ یہ کہ اسی نے پہلے عاد قوم کو ہلاک کر دیا تھا) وہ لوگ ثمود کے دور کے پہلے سے تھے۔ انہیں تیز آندھی کے ذریعہ ہلاک کر دیا گیا تھا۔

(۵۱) **وَ ثَمُوْدَا** (ترجمہ:۔ اور قوم ثمود کو) یعنی اس نے ثمود کو ہلاک کر دیا جیسے عاد اولیٰ کو کیا تھا۔ **فَمَاۤ اَبْقٰى** (ترجمہ:۔ باقی نہیں چھوڑا) دونوں میں سے کسی کو۔

(۵۲) **وَ قَوْمَ نُوْحٍ** (ترجمہ:۔ اور قوم نوح کو) غرق کر کے قوم نوح کو ہلاک کر دیا۔ **مِنْ قَبْلُ** (ترجمہ:۔ پہلے سے) یعنی عاد و ثمود سے پہلے۔ **اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ** (ترجمہ:۔ بے شک وہ بڑے ظالم تھے) عاد و ثمود سے بھی کہیں زیادہ۔ **وَاَطْغٰى** (ترجمہ:۔ بڑے سرکش) ان سے اور تکبر و نخوت میں تمام مشرکوں سے بڑے ظالم تھے۔

(۵۳) **وَالْمُؤْتَفِكَةَ** (ترجمہ:۔ اور الٹنے والی بستیوں کو) الایتفاک کے معنی ہیں الٹنا اور تبدیل کر کے رکھ دینا۔ زجاج نے کہا ہے کہ کہا گیا ہے کہ وہ ہلاک کرنے والوں کی جمع ہے جسے ہلاک ہونے والے کے لئے کہا جاتا ہے کہ انقلبت علیه الدنیا۔ نضر بن انس نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اے بیٹے بصرہ میں ہرگز نہ جانا کہ وہ الٹنے والی بستیوں میں سے ایک

بستی ہے جو اپنے باشندوں کے ساتھ دو مرتبہ الٹائی گئی ہے۔شمر نے کہا ہے کہ موتفکۃ سے مراد یہ ہے کہ یہ دو بار غرق کی گئی ہے۔اس کے غرق ہونے کو اس کے انقلاب کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اس سے مراد لوطؑ کا شہر ہے اور اُسے زمین میں دھنسا کر منقلب کرنے کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔ اَهْوٰى (ترجمہ:۔ نیچے پھینک دیا) یعنی گرادیا یعنی جبرائیلؑ نے اس بستی کو آسمانوں کی طرف اونچا کرنے کے بعد زمین کی طرف اوندھا کر کے گرادیا۔مبرد نے کہا ہے کہ "جعلها تهوى" اُسے (اوندھا) کردیا۔

(۵۴) فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى (ترجمہ:۔تو اس کو ڈھانپ لیا ڈھانپنے والی چیز نے) یعنی اُسے (مکمل طور پر) ڈھانپنے والے عذاب نے ڈھانپ لیا اور اس میں بہت بڑی تخویف ہے جو کہ پوشیدہ بھی نہیں ہے۔

(۵۵) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں شک کرتے رہو گے)۔آلاء کے معنی ہیں نعمتیں معنی یہ ہیں کہ اے انسان ترے رب نے "رزق" وافر مقدار میں عیش، مال، اولاد، لباس، کھانا پینا، شادی بیاہ، سرداری، حکومت وغیرہ جیسی نعمتیں جو دے رکھی ہیں وہ محض اللہ کا فضل وکرم ہی ہے۔تو کب تک اپنے منعم سے اعراض کرتے رہو گے اور کب تک اس سے کھنچے رہو گے۔یعقوب اور ابن محیصن نے اسے ایک مشدّد "تا" کے ساتھ "تمارٰى" بھی پڑھا ہے۔

(۵۶) هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (ترجمہ:۔ یہ ایک ڈرانے والے ہیں پہلے ڈرانے والوں میں سے) یعنی محمد ﷺ تمہاری طرف متقدمین رسولوں میں سے بھیجے گئے ہیں تو وہ تمہیں ڈراتے ہیں جس طرح اُن رسولوں نے اپنی امتوں کو ڈرایا تھا۔

(۵۷۔۵۸) اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ o لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (ترجمہ:۔آنے والی قریب آچکی اللہ کے علاوہ اُسے کوئی ٹالنے والا نہیں) اَزِف یازف ازفاً کے معنی ہیں اقتراب ہر قریب ہونے والی شیئے کے لئے کہا جاتا ہے کہ "اَزِفَ" معنی یہ ہے کہ قیامت قریب آچکی ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ ازف الوقت و حَانَ الاجل یعنی وقت آ گیا۔

(۵۹) اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ (ترجمہ:۔تو کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو) یعنی تم لوگ جھٹلاتے ہوئے اس پر کیوں تعجب کرتے ہو۔

(۶۰) وَتَضْحَكُوْنَ (ترجمہ:۔اور تم ہنستے ہو) اس کا مذاق اڑاتے ہو۔ وَلَا تَبْكُوْنَ (ترجمہ:۔اور روتے نہیں ہو) خوف سے۔مروی ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد تبسم کے سوا، ہنستے ہی نہیں تھے۔

(۶۱) وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (ترجمہ:۔اور تم کھیل میں گرفتار ہو) مبرد کہتا ہے "سامدون" کے معنی "خامدون" ہیں (بجھے ہوئے) ابن اعرابی نے کہا ہے کہ سمود کے معنی ہیں لَهو (کھیل کود) اور ابوعبیدہ نے کہا ہے حمیر کی لغت میں السمود کے معنی الغناء ہیں۔

(۶۲) فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (ترجمہ:۔تو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو) مروی ہے کہ رسول ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ فرمایا اور کافروں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ یہ سجدہ تلاوت ہے۔ یہ بھی قول ہے کہ یہ فرض سجدہ ہے۔ واللہ اعلم